پاکستانی اُردو ناول میں مزاحمتی کش مکش: تاریخی تناظر میں

Resistive Struggle in Pakistani Urdu Novel: In Historical Perspective

Dr. Muhammad Kamran Shahzad
kamranshehzadranjha786@gmail.com
Lecturer, Urdu Department, Punjab College, Sargodha, Pakistan

KEYWORDS

Historical
Resistance
Establishment
Generations
Economic
Social

DATES

Received	**29-07-2023**
Accepted	**15-08-2023**
Published	**30-12-2023**

QR CODE

ABSTRACT

History reveals the experiences of previous generations in different areas of life of the members of any society to the present generation, many writers of Urdu have described historical events in the story to highlight social, social and economic problems in the text. In this paper, these novels published after the establishment of Pakistan have been included, in which historical events have been directly or indirectly included in the narrative. Writer has highlighted different aspects of resistance in this article.
DOI:
http://journals.mehkaa.com/index.php/negotiations/article/view/74

تلخیص:

تاریخ کسی بھی معاشرے کے افراد کی زندگی کے مختلف شعبوں میں گزشتہ نسلوں کے تجربات کو موجودہ نسل کے سامنے عیاں کرتی ہے ،اُردو کے متعدد ادیبوں نے متن میں سماجی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے تاریخی واقعات کو کہانی میں سلسلہ وار ترتیب سے بیان کیا ہے۔اس مقالے میں قیام پاکستان کے بعد شایع ہونے والے ان ناولوں کو شامل کیا گیا ہے، جن میں بلواسطہ یا

بلاواسطہ تاریخی واقعات کو بیانیہ میں شامل کیا ہے۔راقم نے اس مقالے میں ان ناولوں میں تاریخی واقعات میں مزاحمت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

اُردو میں لفظ" تاریخ "انگریزی لفظ history کا متر داف ہے۔علمِ تاریخ وہ علم ہے ،جس میں مختلف قوموں کے بادشاہوں، انبیا کرام ،فاتحین اور مشہور شخصیات کے عظیم کارناموں کو بیان کیا جاتا ہے۔ تاریخ در حقیقت کسی قصے کہانی کا نام نہیں بلکہ تاریخ مختلف خطوں کی صدیوں کے واقعات کو سمیٹتی ہے۔ تاریخ مختلف زبانوں اور ممالک کے تہذیب و تمدن کا عکس ہوتی ہے۔ تاریخ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ قوموں کا عروج وزوال، حکومتوں کا انحطاط اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالتی ہے۔ مختلف اقوام کی تاریخ سے ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کن کن قوموں نے تاریخ میں کن کن میدانوں میں کارنامے سر انجام دیے ہیں۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان تاریخ کے ذریعے اپنے ماضی کے نہاں گوشوں کا کھوج بھی لگا سکتا ہے اور اس کا از سرِ نو جائزہ بھی لے سکتا ہے۔

جس طرح کسی بھی قوم،زبان اور ملک کی تاریخ ہر عہد کے انسانی ذہن،انسانی تخیل اور سماج پر اثرات مرتب کرتی ہے اسی طرح ادب بھی انہی عوامل کو بروئے کار لا کر تخلیق ہوتا ہے اور تخلیق کار تاریخی واقعات کے نامعلوم گوشوں کو تاریخی صداقت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اُردو ادب کے تخلیق کاروں نے بھی شاعری اور فکشن کے ذریعے نا صرف ہندوستان اور یونان کی تاریخ اور اسلامی تاریخ کے حقائق بیان کیے بلکہ جہاں ضرورت محسوس کی وہاں تاریخی موشگافیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔اس ضمن میں اُردو ناول نگاروں نے ناولوں میں انسانی تاریخ کے پہلوؤں کو اجاگر کیا بلکہ کئی ناول نگاروں نے تو بعض ناولوں میں کسی خاص تاریخی واقعہ کو موضوع بنایا ہے اور اپنی عصری صورتِ حال کو تاریخ کے آئینے سے دیکھا ہے:

"ناول نگار چونکہ اپنے ناول میں ایک دور کی،ایک عہد کی زندگی پیش کرنا چاہتا ہے۔وہ جس دور میں بھی جھانکے گا اس کی مکمل زندگی تلاش کر کے تمام انسانی رشتوں کو دیکھنا چاہے گا۔(1)

تاریخ کو دو حوالوں سے اُردو ناول کے موضوعات میں سمیٹا گیا ہے۔ایک طرف ناول نگاروں نے فسادات، ضیا کا مارشل لا، سقوطِ ڈھاکہ اور نائن الیون کے ساتھ ساتھ کشمیر اور افغان جنگ کو ناول میں شامل کیا ہے تو دوسری طرف بین الاقوامی لحاظ سے قیامِ پاکستان سے پہلے کے واقعات اور فلسطین کے ساتھ ساتھ امریکہ اور روس میں بسنے والوں کی تلخ زندگی کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرا گیا۔

قُرۃ العین حیدر نے جس دور میں لکھنا شروع کیا اس دور میں ایک طرف سیاسی اور معاشرتی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی تھیں تو دوسری طرف کئی ادبی تحریکیں اور نظریات ابھر کر سامنے آ رہے تھے۔ ترقی پسند تحریک بھی ان میں سے ایک ہے۔ اس تحریک کی نمایاں خصوصیت حقیقت نگاری ہے۔اسی ماحول کے زیر اثر قُرۃ العین حیدر نے ایک نئی حقیقت نگاری کی روایت قائم کی۔ اس روایت کو "تاریخی حقیقت نگاری "کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ان کا سب سے مشہور ناول "آگ کا دریا" ہے۔ اس ناول کا دورانیہ ہندوستان کی قدیم تاریخ سے لے کر عہدِ جدید بلکہ تقسیم کے بعد کے کئی برسوں پر محیط ہے۔ نیلم فرزانہ ناول کے تاریخی حوالے سے لکھتی ہیں:

"یہ گویا پورے ہندوستانی کلچر اور کلچر کی تبدیلیوں کی ایک رزمیہ داستان ہے۔ جس میں ہندوستان کے کئی لوگوں کا دل دھڑک رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کی فضا میں جب روایت سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا گیا تو ایسے میں "آگ کا دریا" جیسا ناول سامنے آنا قاری کے لیے یقیناً حیرت اور مسرت کا باعث رہا ہو گا۔"(2)

قراۃ العین حیدر کا تاریخی ناول "آگ کا دریا"(1959ء) کو پڑھ کر جو بھی مجموعی تاثر ابھرتا ہے وہ ناول کے موضوعات کی پہچان کراتا ہے، چنانچہ اس ناول کا موضوع انسانی وجود یا وقت ہی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ اُردو ادب میں پہلی کامیاب کاوش ہے، جس کی بنیاد وقت کے فلسفے پر رکھی گئی ہے۔ تاریخ اور وقت کے مابین فلسفیانہ رشتہ ہے اور اس رشتے میں وقت کی اہمیت مسلّم ہے علاوہ ازیں تاریخ میں وقت ایک ایسا تسلسل ہے، جس کو انسانی آنکھ دیکھنے سے قاصر ہوتی ہے۔ خورشید انور "آگ کا دریا" کے موضوعات میں سے "وقت" کو بنیادی موضوع گردانتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"آگ کا دریا' میں تو وقت ہی تمام واقعات کا مرکز بن کر اُبھرتا ہے۔ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ صحیح معنوں میں وقت ہی اس ناول کا ہیرو ہے۔"(3)

تکنیکی اعتبار سے بھی یہ ناول اہمیت کا حامل ہے کیونکہ شعور کی رو اور خود کلامی کی تکنیک کے ذریعے مصنفہ نے ہندوستان کی اڑھائی ہزار سال کی تاریخ چار ادوار میں منقسم کی ہے۔ دورِ اول میں قدیم ہندوستانی تاریخ سے لے کر مسلم حکومت کی ابتدا تک کے واقعات پیش کیے ہیں۔ دوسرے دور میں مسلمان حکمرانوں کے عروج کی داستان بیان کی ہے۔ تیسرے حصے میں اودھ کے حکمرانوں کے زوال کی کتھا لکھی ہے اور آخری حصہ بعد از قیامِ پاکستان کے منظر نامے پر مشتمل ہے۔

ناول کا حصہ اول ویدک عہد سے لے کر موریہ خاندان کے دور حکومت تک محیط ہے۔ اس حصے کا مرکزی کردار "گوتم" ہے جو کہ فلسفے کا طالب علم ہے اور اپنی فلسفیانہ تخیل کے سبب انفرادیت رکھتا ہے۔ جس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان اکیلا ہے لیکن وہ کئی فلسفوں میں گھرا ہوا ہے۔ مصنفہ نے گوتم کو مختلف زمانوں میں مختلف ناموں مثلاً ابوالمنصور، نواب کمن اور کمال رضا کی صورت میں تخلیق کیا ہے۔ ناول کے اس حصے میں ہندو دھرم کے سماج اور وقار کو سلیس اسلوب سے ایسے بیان کیا ہے کہ قاری اڑھائی ہزار سال کی تاریخ کو موجودہ عہد میں محسوس کرتا ہے۔ ایک طرف گوتم، چمپک سے محبت کرتا ہے، جو کھو چکی ہے لیکن اس کی یاد گوتم کے دل میں زندہ ہے تو دوسری طرف اچانک گوتم کا سامنا چندر گپت کی فوج سے ہو جاتا ہے اور گوتم نیلمبر جیسا امن پسند آدمی لڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس جنگ میں اس کی انگلیاں کٹ جاتی ہیں۔ گوتم نیلمبر کی کٹی انگلیاں اس امر کی غماز ہیں کہ فنکار جو امن اور سکون کا متلاشی ہوتا ہے، وقت کی جبریت اور ظلم کا سامنا یا تو کر نہیں سکتا اور اگر کرتا ہے تو اپنی کمزوری کی وجہ سے اس ظلم کو روکنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔

قرۃ العین حیدر کا انداز بیان عمدہ ہے۔ وہ فلسفیانہ گفتگو کو اس انداز سے بیان کرتی ہیں کہ قاری کو اس میں دلچسپی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یوں تاریخی شعور میں رچی بسی فلسفیانہ نثر قاری کو وقت کی کشش سے آزاد کرتے ہوئے اس عہد میں لے جاتی ہیں جس میں گوتم سانس لیتا تھا۔ گوتم کے سوچنے کا انداز اور اس دور کے مختلف اندازِ رہن سہن کی فطری انداز میں ناول نگار نے عکاسی کی ہے۔

دوسرے حصے میں افغان قوم کا ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد کے مناظر کو پیش کیا گیا ہے جہاں مختلف مذاہب کے باوجود ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی فضا قائم کی۔ دوسرا دور ہند اسلامی تہذیب کے امتزاج کا دور ہے، اس دور کا نمائندہ کردار "ابوالمنصور کمال" ہے۔ یہ مسلمانوں کی مستحکم حکومت کا دور ہے۔ کمال بادشاہ کے ساتھ جنگوں میں بھی حصہ لیتا ہے۔ جنگ کی تباہ کاریاں اس کے ذہن کو متاثر کرتی ہیں۔ وہ انسانوں کے خون کو دیکھ کر وحشت زدہ اور پریشان ہوتا ہے۔ قراۃ العین نے جنگ کی تباہ کاریوں سے متاثر ہونے والے عام آدمی کی کیفیات اور خیالات کی عکاسی عمدگی سے کی ہے۔ چنانچہ جنگ کی ہولناکیوں سے گھبرا کر امن اور سکون کے متلاشی کمال کے دیوانہ ہونے اور شراب میں پناہ ڈھونڈنے سے لے کر صوفیا خصوصا کبیر کی تعلیمات میں پناہ ڈھونڈنے کی خواہش مزاحمت کے ذیل میں ہی آتی ہے جس کا اظہار مصنفہ نے کمال ہنر مندی سے کیا ہے۔ "کمال" جو، اب ہندوستان کو ہی اپنا وطن تصور کر لیتا ہے آخر کار شیر شاہ کے سپاہیوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے کیونکہ اس پر غداری کا الزام لگا کر اسے مار دیا جاتا ہے۔ یوں کمال بھی تاریخ کے جبر کا شکار ہو جاتا ہے۔ مصنفہ نے گوتم کی مزاحمتی سوچ کی عکاسی عمدگی سے کی ہے۔ گوتم کہتا ہے:

> "مجھے کوئی بتاؤ۔ تم سب جو کلاکار اور عالم یہاں موجود ہو۔ بتاؤ کس وقت لڑا جائے کس وقت نہیں۔ کوئی ہری شنکر سے یہ پوچھنے جاؤ۔ جیو ہتیا کس سے جائز ہے، کس سے ناجائز۔۔۔۔ مجھے تو ان سب کی جانیں بہت پیاری ہیں۔ اب میں کیا کروں گا۔"(4)

مصنفہ نے تیسرے حصے میں لکھنؤ اور فیض آباد کی عکاسی کی ہے اس مشترکہ تہذیب میں ہندو جوگی اور مسلم صوفیا کا اظہار کیا ہے علاوہ ازیں مغل حکمرانوں کی زوال پذیر داستان بھی بیان کی گی ہے۔ اس دور میں ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت مستحکم ہو چکی ہے۔ سرل ہارڈ ایشلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لوٹ مار کے دور کا نمائندہ ہے، جو ہندوستانی عوام کا جسمانی اور معاشی استحصال کر رہا تھا۔ اس دور کا نمائندہ کردار "کمال الدین" کا ہے جو مجبور اور بے بس ہندوستانی کسانوں کا نمائندہ ہے۔ اگرچہ وہ جبر کا شکار ہے لیکن وہ ہمت نہیں ہارتا۔ کمال الدین کی مزاحمتی سوچ کی عکاسی ان الفاظ کے ذریعے ہوتی ہے:

> "بنگال کا کسان ابوالمنصور کمال الدین زندہ ہے۔ وہ تو اپنے چھوٹے سے نوکے میں بیٹھا پدما کی تند موجوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔ نوکا پدما کی لہروں پر ڈولتا جا رہا ہے۔ آگے جدھر گھپ اندھیرا ہے اور فضاؤں میں طوفان لرز رہے ہیں۔ اور تاریک دھاروں میں مہیب ناکے منھ پھاڑے بیٹھے ہیں اور ہوائیں بہت تیز ہیں مگر پدما

کے اس بوڑھے فاقہ زدہ ملاح کی کشتی بڑے مزے سے عناصر کا مقابلہ کر رہی ہے۔ کیونکہ عناصر کی بے رحمی اور موت کے خطروں سے اس کی پرانی دوستی ہے۔"(5)

آخری حصہ ہندوستان میں انگریز عہد اور تحریک آزادی کے متعلق خیالات کا اظہار ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مصنفہ کا یہ ناول تاریخی شعور سے لبریز ہے تو غلط نہ ہو گا سید وقار عظیم ناول کے موضوعات کے متعلق لکھتے ہیں:

"آگ کا دریا" میں۔۔۔۔۔ تاریخ کے ہزاروں صفحوں کا نچوڑ، فلسفے کے بے شمار نظریات کی روح، ادب و شعر کے بے اندازہ رنگوں کا امتزاج اور تہذیبوں، معاشرتوں، مذہبوں، رسموں اور روایتوں کے امتیازی خط و خال کی مصوری ہے۔"(6)

تاریخی شعور کی چاشنی سے لبریز اس ناول میں مزاحمت کی مختلف پرتیں کھلتی نظر آتی ہیں۔ ناول نگار نے اس کا اظہار عمدگی سے کیا ہے۔ اگر مزاحمتی حوالے سے دیکھا جائے تو "گوتم" کا کردار مزاحمتی ہے جس کی تحلیل نفسی ناول نگار نے منفرد انداز میں کی ہے اس کا اندازِ فکر اس کے خلاف سوچ اور پھر وقت پڑنے پر نہ صرف جنگ میں کودنے، دشمن فوج کے جیتے جاگتے اپنے جیسے پانچ سپاہیوں کو قتل کرنے اور دن رات بھرپور مزاحمت کرنے کے بعد ہاتھوں کی انگلیاں کٹوا دینے کی لرزہ خیز حقیقت کو دردمندی سے رقم کیا ہے۔ یہاں انھوں نے اس ازلی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ کمزور سے کمزور اور پرامن انسان بھی جب اس کو زندگی کے لالے پڑ جائیں تو اپنی جان بچانے کی خاطر بھرپور مزاحمت کرتا ہے۔ "گوتم" اگرچہ ایک فلسفیانہ سوچ رکھنے والا امن پسند شخص ہے لیکن وقت پڑنے پر اپنی جان بچانے کی خاطر بھرپور مزاحمت کرتا ہے۔ چنانچہ ناول میں "گوتم" کا کردار اس کی حقیقی مثال ہے:

"وہ جنگ کے خلاف تھا اور اس نے اپنی تلوار سے شراوستی کے معرکے میں مخالف فوج کے پانچ سپاہیوں کو قتل کیا۔ پانچ انسان۔ جو اس کی اپنی دنیا کے باسی تھے۔۔۔۔۔ یہاں رنگوں اور پتھروں کی سنگت میں وہ زندہ رہا، لیکن جنگ میں لڑتے سمے "دشمن" کی تلوار سے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں قلم ہو گئیں۔ شراوستی کے بازار میں حملہ آوروں سے وہ دن بھر لڑا تھا۔ رات گئے تک لڑتا تھا اور پھر نیزے کی ایک وار کی تاب نہ لا کر گر پڑا۔"(7)

ناول میں پرتگالیوں کی ہندوستان آمد اور ہندی فوج، بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ پرتگالیوں کی جنگ میں مسلمانوں کی بھرپور مزاحمت اور پرتگالیوں کی فتح کے مناظر کو مصنفہ نے اپنے تخیل آفرین صلاحیت کے بل بوتے پر جس انداز میں تحریر کیا ہے وہ لائق تحسین ہے کہ قاری پہلے مسجدوں کو شہید کرنے اور مندروں کو توڑ پھوڑ کے مناظر کو غم زدہ آنکھ سے دیکھتا ہے تو دوسری طرف نوجوان برہم جو کہ اندھا تھا، اس کی پرتگالیوں کے ساتھ لڑائی کے مناظر کی عکس بندی کی ہے وہ قابل دید ہے، جس نے اس لڑائی میں اپنا بازو تک کٹوا دیا تھا۔

قُرۃ العین حیدر کے ہاں تاریخی شعور اپنی پوری رعناہوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ انگریزوں کے ہندوستان میں قدم جمانے کی کوشش کے دوران مختلف ریاستوں کے نوابوں کے خلاف سازشوں اور لڑائیوں کے نتیجے میں ہندوستانی فوج کی طرف سے

بھرپور مدافعت اور انگریز کی چال چل کر بھرپور حملہ کر کے فوج کو ٹکڑوں میں بانٹ دینے کی کہانی کو کربناک کیفیت میں بیان کیا ہے۔ ناول نگار نے یہاں انگریز قوم اور خاص کر انگریز فوج کی پست ذہنیت کی عکاسی خوبی سے کی ہے۔ اقتدار حاصل کرنے کی خاطر ہر عمل کو جائز اور روا رکھنے والے انگریزوں کے کریہہ کردار کی عکاسی عمدگی سے کی گئی ہے جو اپنے قدم جمانے کی خاطر دوسروں میں پھوٹ ڈال کر انہیں تباہ کرتے ہیں اور لڑاؤ اور دیکھو کی پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر احسن فاروقی نے اپنے تاریخی ناول "سنگم"(1960) میں برصغیر کی نو سو سالہ تاریخ کا احاطہ کیا ہے۔ ناول کا آغاز محمود غزنوی کے قنوج پر حملوں سے شروع ہوتا ہے اور ہندوستان میں علاؤالدین خلجی کی فتوحات، مغل حکمرانوں کی تخت نشینی، لکھنؤ اور دہلی کی ریاستوں کا زوال، 1857ء کے ہنگاموں سے گزرتا ہوا قائداعظم کی پالیسیوں تک کے واقعات پر محیط ہے۔ ناول کا مرکزی کردار "مسلم" ہر دور میں زندہ رہتا ہے اور مختلف زمانوں میں اپنی حیثیت برقرار رکھتا ہے۔ ناول نگار نے "مسلم" کے ذریعے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومتوں کے سماجی مسائل کی نشان دہی کی ہے۔ علاوہ ازیں "مسلم" کا کردار ہندوستان کی بدلتی ہوئی تہذیب و ثقافت کا استعارہ بھی ہے۔

ناول نگار نے ناول میں نہ صرف ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی ڈھانچے میں ہونے والی تبدیلیوں کو بیان کیا ہے بلکہ مسلمان حکمرانوں بالخصوص مغلوں کے منفی کردار پر تنقید بھی کی ہے۔ بادشاہ حملوں کے بعد فاتح ہو کر کس طرح مخالفین کے مال مویشی لوٹ لیتے اور ان کی خواتین کا مال تک فروخت کر دیتے تھے۔ اقتدار کی ہوس میں سازشوں کا جال بنتے اور ایک دوسرے کو قتل کرنا معمول بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی مشترکہ تہذیب ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہی۔

جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں کہ ہندوستان میں مسلمان حکمران تخت و تاج کے لیے ایک دوسرے کو خون میں نہلا دیتے جس کے نتیجے میں ناول میں مزاحمتی رنگ بھی عیاں ہوتا ہے۔ سلطان شمس الدین التمش سلطنت دہلی کا تیسرا حکمران تھا، جو قطب الدین ایبک کا غلام تھا۔ ہونہار ہونے کے سبب بادشاہ نے اپنا داماد بنالیا تھا اور صوبہ بہار کا صوبیدار بنا دیا۔ 1211ء میں بادشاہ کے نااہل بیٹے "آرام شاہ" کو تخت سے زبردستی اتار کر حکومت کی باگ ڈور خود سنبھال لی، جس کا رنج آرام شاہ کو تھا دوبارہ حکومت کے حصول کے لیے "آرام شاہ" نے "سلطان شمس الدین التمش" کے خلاف اعلانِ بغاوت بلند کیا لیکن التمش نے اس کی مزاحمت کچل ڈالی اور پہلے ہی حملے میں آرام شاہ مارا گیا۔ مصنف نے اس ناکام مزاحمت کا سلیس انداز میں نقشہ کھنچا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "صبح کو وہ اٹھا تو فوج کا طبلِ جنگ بج رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ آرام شاہ فوج لیے آ رہا ہے۔ سلطان خود سالار فوج ہوا اور اس کے پیچھے کثیر فوج چل کھڑی ہوئی۔ دلی سے کچھ ہی دور پہنچی ہو گی کہ آرام شاہ سے مقابلہ ہوا جس کی فوج ایک ہی معرکہ میں پسپا ہو گئی۔ آرام شاہ مارا گیا۔ فتح کے جھنڈے لہراتی ہوئی فوج دلی واپس آئی۔"(8)

بقول سلطان شمس الدین التمش "میرے بچوں میں سب سے زیادہ ہونہار اور قابل رضیہ ہے" اس لیے سلطان نے اپنا جانشین اپنی بیٹی کو مقرر کیا کیونکہ اس کے بچوں میں وہ سب سے زیادہ اہل وہ ہے۔ سلطان کے انتقال کے بعد اس کے منجھلے بیٹے "رکن الدین سلطان" کو تخت پر بٹھایا لیکن چھ ماہ میں ہی وہ نا اہل ثابت ہوا تو "ترکان" نے رضیہ سلطانہ کو بنایا جو جنوبی ایشیا پر حکومت کرنے والی پہلی خاتون تھی۔ رضیہ نے اقتدار سنبھالتے ہی ناعاقبت اندیش کارروائیوں اور عجیب وغریب فیصلے کرنے شروع کر دیے۔ جب اصطبل کے داروغے "یاقوت" کو امر االبصر بنایا تو ترک سرداروں کی مزاحمت اور بغاوت کو احسن فاروقی نے عمدگی سے رقم کیا ہے، جس کے نتیجے میں یاقوت مارا گیا اور "رضیہ" کو قید کر کے بہرام شاہ کی سلطنت کا اعلان کر دیا گیا۔(9)

بنگال میں جب بلبن کے غلام طغرل نے بغاوت کا اعلان کیا، جس کے مقاصد سیاسی تھے لیکن حکومت کا حصول سب سے اہم مقصد تھا۔ بلبن نے نمک حرام کو پکڑنے کا پختہ ارادہ کیا اور بڑھاپے کے باوجود دلی سے لشکر لے کر نکلا تو اس لشکر میں ناول کا مرکزی کردار "مسلم" کی فوج بھی ہمراہ تھی لشکر کے بنگال پہنچنے تک طغرل فرار ہو چکا تھا تقریباً چھ ماہ کی تلاش کے بعد ایک دستے میں طغرل کو دیکھا تو ابن مسلم کے تیر لگنے سے وہ گھوڑے سے گر گیا۔ طغرل نامساعد حالات کے سبب مزاحمت کامیاب نہ کر سکا اور زخمی ہوا اور بعد ازاں گرفتار کر لیا گیا۔ مزاحمت میں ناکامی کے بعد طغرل کے حامیوں کو دار پر لٹکا دیا گیا۔ مصنف نے اس کربناک منظر کی تصویر کشی عمدگی سے کی ہے:

> "لشکر بنگال کے چپہ چپہ میں پھیلا دیا گیا۔ چھ مہینے کے بعد اب مسلم کے دستہ کو ایک پڑاؤ دکھائی دیا۔ اس کے پاس پہنچ کر شاہی سپاہیوں میں سے ایک طغرل کو پہچانا۔ طغرل بھاگا مگر ابن مسلم نے تیر جو چلایا۔۔ اس کے ایسا لگا کہ وہ گھوڑے سے زمین پر آرہا۔ اس کے ساتھیوں میں کچھ لڑتے ہوئے مارے گئے اور کچھ گرفتار کر لیے گئے۔۔۔ شہر کے بازار میں دورویہ سولیاں لگادی گئیں اوران پر ہر وہ شخص چڑھایا گیا، جو طغرل کا کبھی نہ کبھی طرفدار تھا۔ ایک مست قلندر نے طغرل کو دعادی تھی۔ اُسے بھی سولی چڑھایا گیا۔ سولیاں بڑے بڑے لکڑی کے ستون تھے جن کی نوک پر بھالے کی طرح چوٹی ہوتی تھی۔ ملزم کو اس پر بٹھایا دیا جاتا۔ سولی اس کے جسم میں ۔۔۔ گھستی جاتی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم دو ٹکڑے ہو کر زمین پر گر جاتا۔ دو سو سولیوں پر برابر لوگ چڑھائے جاتے رہے۔"(10)

علاوءالدین خلجی کے حکومت کے حصول کی خاطر جلال الدین خلجی کو مارنے، پھر چھوڑ کر راجپوت سردار کی بیوی پدمنی پر ان دیکھے عاشق ہونے کی مصنف نے عمدگی سے تصویر کشی کی ہے۔ خلجی نے پدمنی کے حصول کے لیے قلعہ پر حملہ کر دیا۔ تمام راجپوت سرداروں نے ناکام مزاحمت کی اور مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوتے رہے۔ مزاحمت ناکام اور سرداروں کے قتل ہونے پر پدمنی سمیت تمام خواتین نے آگ لگا کر خود کو ختم کر دیا تو علاوءالدین خلجی اپنی تلوار زمین پر پٹخ کر کہنے لگا کہ پدمنی نے مجھے ہرا دیا۔ احسن فاروقی نے دہشت ناک کارروائی کی عکس بندی جس انداز میں کی ہے قاری پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔(11)

عبد اللہ حسین کے ناول "اداس نسلیں"(1963ء) کی کہانی جنگِ عظیم اول سے لے کر تقسیم ہند تک محیط ہے۔ناول تین ادوار پر مشتمل ہے۔اول انگریز حکومت، دوم تحریک آزادی اور سوم تقسیم برصغیر کے بعد کا دور ہے۔تینوں ادوار میں برطانوی سامراج، جبر واستبداد اور آزادی تحریک کے مختلف مراحل کو دکھایا گیا ہے۔مصنف نے مختلف تاریخی شخصیات کو جیسے گاندھی، جناح کو ناول کے بیانیے میں عمدگی سے بیان کیا ہے۔ہندوستان کی اس وقت کی سیاسی صورت حال کو ناول نگار نے سادہ انداز میں عمدگی سے بیان کیا ہے۔"نعیم "روشن پور کے رہائشی ایک کاشت کار کا بیٹا ہونے کے ناطے کاشت کاری کے پیشے سے وابستہ ہے اس دوران جنگِ عظیم اول کا آغاز ہوتا ہے تو انگریز سرکار جاگیر داری نظام میں پلنے والے کسانوں کو جبراً فوج میں بھرتی کرتی تھی لیکن نعیم اپنی مرضی سے بھرتی ہو جاتا ہے، جو یورپ اور افریقہ کے مختلف محاذوں پر لڑتے زخمی ہو جاتا ہے۔ناول نگار نے جہاں انگریزوں کی ہندوستان کے عوام کی جسمانی اور معاشی استحصال کو ناول کا حصہ بنایا ہے وہیں جنگ عظیم کی ہولناکیوں کو بھی صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔نعیم جنگ سے واپس آکر سیاست میں دلچسپی لیتا ہے اور علیحدگی پسند تنظیموں سے وابستہ ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا جاتا ہے۔رہائی کے بعد عذرا سے شادی کر لیتا ہے۔نعیم کا کردار تحریک آزادی کے لیے کام کرنے والے نوجوانوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ناول کے آخر میں نعیم انگریزوں کے خلاف مختلف تحریکوں میں حصہ لیتا ہے اسی دوران تقسیم ہند کا واقعہ رونما ہوتا تو نعیم مہاجرین کے قافلے میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔چونکہ "اداس نسلیں" کی کہانی تقسیم سے قبل کی ہے اس لیے ناول میں مزاحمتی رنگ تاریخی تناظر میں نمایاں ہے۔سادہ اور عام فہم انداز میں زندگی بچانے کے لیے چھاؤنی کے کمانڈنگ افسر کرنل جانسن کی طرف سے کی گئی خونی مزاحمت کو جہاں عمدگی سے بیان کیا ہے وہیں دوسری طرف گاؤں میں پناہ حاصل کرنے والے زخمی مہمان کی زندگی بچانے کے لیے روشن علی خان کا باغیوں کے سامنے مردانہ وار ڈٹ جانے کا اظہار یہ بھی دلچسپی کا حامل ہے۔(12)

انگریزوں کے بقول وہ ہندوستان کی اصلاح کر رہے تھے لیکن اصلاح کی آڑ میں بالخصوص مسلمانوں سے تعصبانہ رویہ اختیار کیا تھا کیونکہ گزشتہ کئی صدیوں سے ہندوستان پر مسلمان حکومت کر رہے تھے۔اس تعصبانہ رویے کا شکار جاگیر داری نظام میں پلنے والے چھوٹے کسان بھی ہوئے۔ناول میں بھی انگریزوں نے اپنی ہٹ دھرمی سے ریل گاڑی سے بزرگ کو پیچھے دھکا دے دیا، جس کے سبب وہ گر گیا لیکن گورے کو کسی نے کچھ نہیں کہا۔گورے کی نفرت کے جواب میں بوڑھے کسان کی طرف سے کی گئی کمزور مدافعت اور اس کے رد عمل کے طور پر ظلم وبربریت کی انتہا کرتے ہوئے انگریز کا بوڑھے کو بے دردی سے قتل کر دینے کے الم ناک واقعے کی عکس بندی ان الفاظ میں کی ہے:

> "آں؟ نائیں جاؤ آں؟" اُس نے پیر کی ٹھوکر سے کسان کی گٹھڑی باہر اُچھال دی جو اڑتی ہوئی زمین پر گری اور لوگوں نے اُس میں سے باجرہ اور گڑ بکھرتے ہوئے دیکھا۔"جاؤ"۔"ہا۔۔۔میرا باجرہ۔" بڈھے کا منہ کھل گیا۔پھر دفعتاً غصے سے بھنا کر وہ اُٹھا اور لاٹھی گورے کی ٹانگوں پر مارنے لگا۔"مجھے

> مُردو۔ پھینک دو۔ باجرہ۔۔۔میر اگڑ میں تمہارے باپ سے بھی لوں گا۔ گورے سؤر۔ اب میں اپنی لڑکی کے لیے کیا لے کر جاؤں ؟ہیں؟" چیخنے سے رال اُس کی داڑھی پر بہنے لگی۔ انگریز نے اُس کی لاٹھی چھین کر نیچے پھینک دی اور بڑے بڑے بوٹوں والے پاؤں اندھا دھند اس کے چہرے اور چھاتی پر مارنے لگا۔"(13)

انسان اپنے حق کے حصول کے لیے ہر ممکن جتن کرتا ہے ناول میں مدن اور اس کے گروپ کی انگریز حکومت کے خلاف کی گئی بغاوت کی تفصیل بھی ناول نگار نے بیان کی ہے ،جو اپنے مطالبات منوانے کے لیے سرکاری املاک کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے لیکن نعیم ان کی راہ میں مزاحم ہو گیا اور مدن اور اس کے گروپ کے افراد کو سمجھاتا ہے کہ تم عقلِ سلیم سے کام لو یہاں ایک ریل گاڑی تباہ وبرباد کر دینے سے کیا کر لوگے بلکہ ہندوستان میں ایسی ہی ہزاروں ریل گاڑیاں چل رہی ہیں، جن سے رابطے کی ضرورت ہے جس کے لیے ایک منظم حکمت عملی کی ضرورت ہے اور ہندوستانی سماج اپنی قوت اور طاقت کا احساس رکھتے ہوں کیونکہ تشدد ہونے اور ناحق کسی کا نقصان کرنے سے جسمانی طاقت نہیں بلکہ اپنے باطن میں وہ روح بیدار کر جو تباہ ہونا نہیں جانتی اور جو ہر جسمانی کمزوری پر غالب آسکتی ہے مگر مدن نے نعیم کے فلسفے کو ہوا میں اڑا دیا اور مایوسی سے انکار کرتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے بولا کہ یہ تمہارا فلسفہ ہے میری دماغی وسعت اتنی نہیں ہے۔(14)

نعیم کا کردار مثبت مزاحمت کی عکاسی کرتا ہے جب کہ اس کے برعکس مدن اور اس کے دوستوں کا کردار منفی ہے، جو ملک میں دہشت گردانہ کارروائیاں کر کے ملک میں خوف کی فضا قائم کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ دونوں کا مقصد ایک ہے یعنی انگریز سے آزادی لیکن راستے جدا ہیں۔ اس لیے قاری کی ہمدردیاں نعیم کے ساتھ رہتی ہیں۔

پرنس آف ویلز کے ہندوستان کے دورے کے موقع پر حکومت کی طرف سے سیاسی جماعتوں کو دبانے کے ردعمل اور انڈین نیشنل کانگرس کے بائیکاٹ کرنے پر انگریز سرکار کا اسے خلافِ قانون جماعت قرار دینے کے نتیجے میں ہونے والی مزاحمت کی تصویر کشی مدلل انداز میں کی گئی ہے یہاں مزاحمت کا انداز احتجاجی ہے:

> "دسمبر کے شروع میں 'پرنس آف ویلز' کے ہندوستانی دورے کے سلسلے میں حکومت نے تمام سیاسی پارٹیوں کو دبانا شروع کیا۔ جب انڈین نیشنل کانگرس نے دورے کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا تو اسے خلافِ قانون جماعت قرار دے دیا گیا۔ اس پر بھی والنٹیروں کے ناموں کی فہرستیں شایع ہوتی رہیں اور عام ہڑتال اور شاہی خاندان کے ایک فرد کی آمد کے موقع پر حکومت کی طرف سے جاری کردہ تمام احکامات کی خلاف ورزی اور تقریبات کے بائیکاٹ کی ہدایت کے اشتہارات عوام میں تقسیم کیے جاتے رہے نتیجے کے طور پر حکومت کے اعصاب جواب دے گئے اور وسیع پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں آئیں۔"(15)

احتجاج کا پر امن انداز ملکہ برطانیہ کے بیٹے کے ہندوستان آمد کے موقع پر سامنے آیا جب ہجوم نے اس کے دورے کے دوران پلے کارڈ پر لکھ کر بتایا کہ اپنی والدہ کو بتانا کہ "ہم بھوکے ہیں" انگریز فوج نے اس ہجوم کو منتشر کر دیا۔

1927ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے ایک کمیشن مقرر کیا گیا، جس کے چیئرمین "سر جان سائمن" تھے اسی وجہ سے اس کو سائمن کمیشن کہا جاتا ہے کمیشن کے مقاصد انگریزوں کی منافقانہ رویوں کی کڑی تھے اور کمیشن کے تمام ممبران انگریز تھے۔ اسی سبب ہندوستانی عوام اور سیاسی حلقوں میں احتجاج کی لہر دوڑ گئی۔ عبد اللہ حسین نے بھی اس منظر کو مزاحمتی رنگ میں پیش کیا ہے کہ جب کمیشن اپنی سفارشات لے کر ہندوستان آیا تو ہزاروں افراد کا ہجوم بار بار یہی پکار رہا تھا کہ Simon,Go Back یعنی سائمن واپس چلے جاؤ جو ان حروف کے مفہوم سے ہی واقف نہیں تھے لیکن احتجاج کرنے لیے یکجا ہو گے تھے جس کو پچھلی شام فوج نے منتشر کر دیا۔

ناول نگار نے اپنے قلم سے ہندوستانی عوام کی انگریز سرکار کے جبر و تسلط کے خلاف اٹھنے والی آواز کو بھی بلند کرنے کی سعی کی ہے۔ ناول میں نعیم کا سوتیلا بھائی "علی" نعیم سے لڑ کر لاہور آ گیا جہاں وہ ایک بازار سے گزر رہا تھا کہ ہجوم کے درمیان ایک فرد نے فوج کے جبر کے سامنے مزاحمتی انداز اپناتے ہوئے انگریز کے منہ پر طمانچہ مارا جس کے نتیجے میں انگریز سرکار نے مزاحمت کو کچلتے ہوئے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی، جس کے نتیجے میں کئی انسانی سانسیں رک گئیں۔ اس الم ناک منظر کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

> "اس کے دیکھتے دیکھتے ایک انگریز افسر نے آگے بڑھ کر سرے والے بیلچے بردار سے کوئی بات کی۔ اس نے جواب میں انگریز افسر کے منہ پر زور دار طمانچہ مارا۔ انگریز نے پیچھے کود کر ریوالور نکالا اور ایک فٹ کے فاصلے سے گولی چلا دی۔ گولی اسے آنکھوں کے درمیان لگی اور وہ گر پڑا۔ لیکن اس سے پہلے کہ افسر سنبھلتا عقب سے کسی نے اس کے پہلو میں بلم چبھو دی۔ وہ ریوالور پھینک کر بلم کے دستے پر جھک گیا۔ پیچھے سے دوسرا افسر انگریز جو بھاگا آرہا تھا رک گیا اور ریوالور ہوا میں لہرا کر چلایا: "فائر۔ فائر" مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ چشم زدن میں بازار گولیوں کے خشک دھماکوں اور بارود کی بو سے بھر گیا۔(16)

سائمن کمیشن کے ہندوستان پہنچنے، ان کے مقاصد اور مفاد پرستی کے خلاف مزاحمت نثار عزیز بٹ کے ناول "نے چراغ نے گلُے" (1973ء) میں بھی نمایاں ہے۔ مصنفہ نے تاریخی شعور کی چاشنی سے لبریز اس واقعے کو مزاحمتی رنگ میں بیان کیا ہے۔ ناول میں جب کمیشن کا وفد ہندوستان آیا تو سپاہی کا حکم ملتے ہی لالہ جی کے سر پر ڈنڈے کا وار کیا گیا اور ہجوم میں کھلبلی مچ گئی۔ اس دوران منیر اور منموہن بھی کمیشن کے خلاف ہندوستانی عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے احتجاجی بن گے اس ہجوم کی مزاحمت کی منظر کشی ان الفاظ میں کی ہے:

> "ایک سپاہی نے حکم پاتے ہی لپک کر لالہ جی کے سر پہ ڈنڈے مارنے شروع کر دیے۔ ان کے ہاتھ میں کالی چھتری تھی۔ جس پر "سائمن گو بیک" لکھا تھا۔ وہ گر گئی اور وار ان کے سینے میں لگے۔ وہ لڑکھڑا گئے اور جلوس میں کھلبلی مچ گئی۔ آناً فاناً جلوس بے قرار ہو گیا۔ منیر اور منموہن جواب تک اس تجربے

> کو بحیثیت تماشائی دیکھ رہے تھے اس لمحے یکلخت احتجاجی بن گئے۔ ان کے رنگ زرد ہو گئے اور وفور جذبات سے جسم کانپ رہے تھے۔ جلوس میں سے کسی نے پتھر اٹھا کر پولیس کی طرف پھینکے۔ تشدد نے تشدد کو شہ دی تھی۔ مہاتما کی اہنسا بعض لوگوں کے ذہن سے وقتی طور پر اتر گئی۔ سنگ باری کی شہ پا کر پولیس باڑھ پار کر کے جلوس پر حملہ آور ہو گئی اور جلوس کو منتشر کرنے کو انہوں نے لاٹھی چارج شروع کیا۔"(17)

قرۃ العین حیدر کا ناول "آخر شب کے ہمسفر"(1979ء) بنگال کی دہشت گرد اور انقلابی تحریکوں کے موضوع پر لکھا گیا۔ سرزمین بنگال کی دیومالائی فضا میں پروان چڑھنے والی دہشت پسند تحریک اور اس کا المیاتی انجام اس ناول کا موضوع ہے۔ یہ تحریک ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء کے دوران بنگال میں سرگرم تھی۔ "ریحان الدین احمد" اور "دیپالی سرکار" اس کے اہم رکن تھے۔ دیپالی سرکار کے علاوہ تمام کارکن بالآخر تاریخ اور تقدیر کے جبر کے تحت یا مصلحت کے زیر اثر اپنے خوابوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ نیلم فرزانہ لکھتی ہیں:

> "اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ اور وقت کا مخالف دھارا انہیں اپنے خوابوں سے دور لے جاتا ہے۔ گویا ناول "آخر شب کے ہم سفر" ایک ایسا صنم خانہ ہے جس کے اصنام کا مقدر شکست وریخت سے دوچار ہونا تھا۔ ان میں کچھ نے اپنی مرضی سے اپنے چہرے کے خدوخال بدلے اور کچھ ایسی مورتیاں تھیں جن کی شناخت وقت اور حالات کی جبریت کے گہرے سمندر میں گم ہو گئی اور ان کے مشترک خواب ریزہ ریزہ ہو گئے۔(18)

اس ناول میں مزاحمت کا ایک رخ اس وقت سامنے آتا ہے، جب ریحان پر مکمل دسترس رکھنے کی خواہش مند "اوما" اس کی محبت دیپالی سے دور کرنے کی خاطر اس کے دل میں بدگمانیاں پیدا کر دیتی ہے۔ یہ منفی مزاحمت ہے چنانچہ اس کے نتیجے میں جہاں ریحان، دیپالی سے دور ہوتا ہے وہیں وہ اپنے نظریات سے بھی کنارہ کش ہو جاتا ہے چنانچہ وہ اپنے اس خواب سے کنارہ کش ہوتا ہے، جس کے لیے اس نے اتنی بڑی جدوجہد کی تھی۔

ناول میں تاریخی شعور اپنی پوری صداقت کے ساتھ سامنے ابھرتا ہے۔ وہ غیر جانبداری کے ساتھ معاصر صورتِ حال کا تجزیہ کرتی ہیں مثلاً بنگال میں عیسائیت کی فروغ کی دو وجوہات بتائی ہیں وہ مبنی بر حقیقت ہیں کیونکہ انیسویں صدی کے اوائل میں بنگال اور برصغیر پاک و ہند تنزلی کا شکار تھا اس لیے وہاں سب سے بڑا مسئلہ غربت کا تھا۔ مصنفہ نے ناول میں سوانح نگار مہندر ناتھ گپتا کی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے بنگال میں عیسائیت کے فروغ کا بڑا سبب غربت قرار دیا، جس کے نتیجے میں متعدد انگریز تعلیم یافتہ خاندان احتجاجاً عیسائی ہو گے کیونکہ ان کے نزدیک عیسائیت مذہب میں ہی قوم کا روشن مستقبل ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ماضی قریب کی مزاحمتی تحریکوں اور ان کے سر کردہ راہنماؤں اور کارکنوں کی بغاوت اور مزاحمت کا ارضی حقیقتوں کی روشنی میں تاریخی شعور کی چاشنی سے لبریز عمدہ تجزیہ کیا۔ انھوں نے اختصار کے پردے میں رہتے ہوئے عدم تعاون اور خلافت کی تحریک کی ناکامی کے سبب 1942ء میں شروع ہونے والی دہشت پسند تحریک کا ذکر کیا۔ جنھوں نے انقلاب کا نعرہ لگانے پر انقلابیوں کی نئی نوجوان ترک پارٹی کے افراد کو برطانوی فوج نے مشین گنوں سے شہید کر دیا تھا کئی افراد کو قید کر لیا گیا۔ اس مزاحمتی صورتِ حال کی عکس بندی جس جامعیت اور حسنِ کمال سے کی ہے۔ وہ قابل تحسین ہے۔

سامراجی قوتوں کی محض اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر پسماندہ ممالک میں خانہ جنگی کی صورتِ حال پیدا کرنے اور اس صورتِ حال کے فائدے اٹھانے کی مذموم خواہش کو قرۃ العین حیدر نے دیانت داری کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ مزاحمت کا وہ نیا دور کھلا جس کے نتیجے میں آزاد مملکتوں پاکستان اور ہندوستان کے قیام کی کوشش کو جلا ملی۔

ناول کا مرکزی کردار "ریحان الدین" جب دہشت پسند تنظیم سے منسلک ہوا تو 1940ء میں پولیس نے دریائی رستوں کے ذریعے ریحان الدین کے خفیہ پریس پر چھاپا مارا لیکن ریحان الدین اور اس کے ساتھی بھاگنے میں کامیاب ہو گے لیکن جنگ کے خلاف اور جنگی پرچار پر ریحان الدین کا لٹریچر شایع بھی ہوتا رہا اور تقسیم بھی ہوتا رہا۔ مصنفہ نے باغیوں اور پولیس کے درمیان آنکھ مچولی کھیلنے اور باغیوں کو پکڑنے کے لیے پولیس طرف سے بنایا جانے والا ناکام پلان کے رد عمل کے طور پر لٹریچر کی تقسیم کو عمدگی سے بیان کیا ہے:

> "9 جنوری 1940ء کو پولیس نے دریائی راستوں کی ناکہ بندی کر کے ریحان الدین احمد اوراس کے ساتھیوں کے خفیہ مستقر اور خفیہ پریس پر چھاپہ مارا۔ مگر ریحان الدین احمد اوراس کے ساتھی وہاں سے غائب ہو چکے تھے اوراب کی مرتبہ وہ ایسے غائب ہوئے تھے کہ پانچ اضلاع کی پولیس ان کی تلاش کرتے کرتے عاجز آ گئی مگر ان کا سراغ کہیں نہ ملا۔ یورپ میں جیسے جیسے جنگ نے زور پکڑا اور برطانیہ کمزور پڑتا گیا۔ہندوستان میں پولیس کی سرگرمیوں سے جاری رہی۔ مگر وہ سب شاید فضا میں تحلیل ہو چکے تھے۔ لیکن جنگ کے خلاف اور خانہ جنگی کے پرچار میں ان کا لٹریچر اسی طرح خفیہ ٹھکانوں سے چھپتا اور تقسیم ہوتا رہا۔"(19)

ناول نگار ارضی حقیقتوں سے آنکھیں نہیں چراتیں بلکہ سادہ اور عام فہم انداز میں ملکی معیشت اور سیاست میں عام آدمی کے کردار اور سیاسی اشرفیہ کے رویوں پر سیر حاصل بحث کرتی ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور غلامانہ ذہنیت کے حامل سیاسی نظام کے ملکی نظام معیشت کا بیڑہ غرق کرنے کی داستان الم ناک اور دیانت داری سے بیان کیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام لڑاؤ اور تقسیم کرو کی پالیسی پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ مصنفہ نے برطانوی سامراج کی انسان کش پالیسوں کے سبب فرقہ وارانہ کشیدگی کا نمونہ اور مزاحمتی در کھلنے کی عکاسی ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"ہندوستان کے نوے فیصدی انسان مفلس ہیں اوراہلِ ثروت مفلس کی تلخی، کم مائیگی، کمتری اور بے عزتی کے احساسات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ زندہ رہنے کی جدوجہد، کلچر اوراخلاق اور مذہب اور فلسفے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ انسان کو جھوٹا اور گھٹیا اور کمینہ اور کردار سے عاری بنادیتی ہے۔ ہم ہندوستانی اسی لیے جھوٹے اور کمینے اور کردار سے عاری اور بے ایمان ہیں۔۔ماضی سنہرا تھا۔۔کیونکہ آبادی کم اور گیہوں اور چاول وافر تھا۔ لیکن کولونیل نظام اور بڑھتی ہوئی آبادی نے ملک کا کچومر نکال دیا۔ ہندوستان والوں کو جھوٹا اور بے ایمان بنادیا۔ ہر کولونیل ملک کے باشندے لامحالہ گھٹیا اور کردار سے عاری ہوجاتے ہیں۔ غلامانہ ذہنیت بے معنیٰ اصطلاح نہیں ہے۔(20)

معاشرتی ناولوں کے ساتھ ساتھ جمیلہ ہاشمی نے تاریخی ناول بعنوان "دشت سوس" تحریر کیا جو کہ (1983ء) میں شایع ہوا، جو بغداد کے درویش صفت "منصور حلاج" کے متعلق لکھا ہے۔ حسین بن منصور حلاج 858ء میں فارس (ایران) کے شمال مشرق میں واقع قصبے طُوس (الطور) میں پیدا ہوئے۔ حسین کے دادا "محمی" آتش پرست تھے۔ فقط آتش پرست نہیں بلکہ طوس اور اس کے گردونواع میں وہ مجوسیوں کے سب سے بڑے عالم تھے۔ حسین ابتدا ہی میں غیر معمولی ذہانت کا حامل تھے اور باغیانہ شاعری کرتے تھے انہوں نے مجوسیت، یہودیت اور مسلمان عیسائیت کے ساتھ اسلام کا تقابلی مطالعہ کیا اور قرآن کی تعلیمات سے متاثر ہو کر قرآن کی نئی تفسیر کی، اس پر شعبدہ گری کا الزام لگا۔ شریعت کے حوالے سے سُہیل تُستری کو اپنا استاد مانتا تھا۔ تصوف کے عقیدہ کے حوالے سے ابن منصور وحدت الوجودی کا حامی تھا اور انسانی باطن میں خدا کے وجود کو تسلیم کرتا تھا اسی لیے اس کے نظریات میں انسان کو اہمیت حاصل ہے۔ حلاج نے تصوف کے موضوع پر متعدد کتب اور رسائل قلم بند کیے حلاج نے انا الحق کا نعرہ (میں حق ہوں) لگایا۔ 909ء میں ابن داؤد الاصفہانی کے فتوے کی بنیاد پر پہلی مرتبہ گرفتار کیا گیا۔ 913ء میں دوسری مرتبہ گرفتار ہوا اور 8 برس مسلسل اسیر رہے بالآخر 922 عیسوی بروز پیر بغداد میں دریائے دجلہ کے مغربی کنارے حسین بن منصور حلاج کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔ وفات کے بعد علما کے ایک گروہ نے اس کو کافر قرار دیا جبکہ دوسرے گروہ جس میں رومی اور شیخ فرید الدین عطار جیسے مدبر شامل تھے۔ انھوں نے حلاج کو ولی اور شہید قرار دیا۔ جمیلہ ہاشمی نے ناول میں جہاں منصور حلاج کی زندگی کے اہم گوشوں کو اجاگر کیا ہے وہاں حکومت وقت کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم کے مناظر کی عکس بندی بھی کی ہے۔ علاوہ ازیں ناول میں دسویں صدی کے مذہبی، سیاسی اور سماجی حالات کو بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر سید جاوید اختر ناول کے موضوع کے متعلق لکھتے ہیں:

"دشتِ سوس ایک کرداری ناول ہے جس کی کہانی آتش پرست محمی کے پوتے اور نومسلم منصور کے بیٹے حسین کے گرد گھومتی ہے۔۔۔۔۔۔ حسین ابن منصور کے مخصوص فکری تناظر کی روشنی میں تحریر کردہ یہ ایک خوب صورت ناول ہے جس میں مصنفہ نے ثابت کیا ہے کہ اگرچہ عشق مزرع گلاب بھی ہے اور مزرع زندگی بھی لیکن کبھی کبھی یہ اپنی جان سے گزر جانے کا نام بھی بن جاتا ہے"(21)

ناول نگار نے اسلامی تصوف کے یگانہ روز گار شخص "حسین بن منصور" کی زندگی اور اس عہد کی تصویر کشی کی ہے وہیں حسین کے کردار میں مزاحمتی رویوں کو بھی تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ علم کی تڑپ اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی لگن میں شیخ سہیل بن عبداللہ کی کتابوں کو پڑھنے کی جستجو، شیخ نے اس کو طلب کر کے کتابوں سے دور رہنے کی تلقین کی کہ یہ کتب تمھاری سمجھ سے بالاتر ہیں. یہ تمہارے لیے نہیں ہیں تو حسین کے بھرپور مزاحمتی جواب کی عکس بندی یوں کی ہے:

"شیخ نے نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔ "حسین اندر آؤ"۔ وہ نہ خفا تھے اور نہ ہی خوش۔۔۔۔۔۔۔ تمہیں معلوم ہے تمہاری طلبی کیوں ہوئی ہے؟ انہوں نے بہت نرمی سے پوچھا۔ اس نے گردن نے جھکا لی۔۔۔۔۔ یہ سب رسالے ابھی تمہاری فہم اور ادراک سے پرے ہیں۔ یہ تمہارے لیے نہیں ہیں۔۔۔" جی"۔۔۔اس نے کہا۔ مگر میں انھیں سمجھنے کی کوشش تو کر سکتا ہوں۔"(22)

دشتِ سوس" حسین بن منصور" کے المیے پر مشتمل ہے اور المیہ ہمیشہ مزاحمت کے جلو میں پرورش پاتا ہے اس ناول میں جمیلہ نے لاجواب انداز میں مزاحمت کے جلوہ ہائے رنگ متعارف کروائے۔ ناول میں خاتون عیسائی راہبہ کہتی ہے کہ ہمیں تربیت ہی اس لیے دی جاتی ہے کہ ہم نسطوری راہبائیں مسلمانوں کی نسل میں زہر بھر سکیں کیونکہ ان کی رگوں میں ہمارا خون ہو گا تو وہ اپنے ایمان میں کمزور ہو جائیں گے۔ عیسائی راہبہ کی مسلمانوں کے خلاف مزاحمتی مکالمہ دلچسپ بھی ہے اور حیران کن بھی ہے۔ جمیلہ نے " حسین" کے کردار کی نفسیاتی تحلیل عمدگی سے کی ہے اس کردار میں دکھوں، غموں اور نفرتوں کے خلاف سینہ تان کر لڑنے کا جذبہ موجود ہے۔ حسین کے اندر بھڑکتی آگ کو جمیلہ نے یوں بیان کیا ہے:

"اس مجبوری سے رہائی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔ مقدر سے لڑنا چاہے جو جی میں ہے، اسے کہنے کی آزادی آدمی کو ہو۔ خدا کی بادشاہی میں بھلا انسان اتنا مقہور و مجبور کیوں ہو؟ اغول مجبور کیوں ہو، حسین مجبور کیوں ہو، کوئی ذی روح بھی مجبور کیوں ہو۔ ہاں، کیوں؟ کیوں؟ آخر کیوں؟"(23)

نسطوری راہبوں کا قافلہ پانی لے کر روانہ ہوا تو صبح کے قریب زنجیوں کا گروہ، جو بصرہ میں بڑا سر گرم تھا۔ ان پر حملہ کر دیا، جس کے نتیجے میں بھگڈر مچ گئی اونٹ اور گھوڑے بے قابو ہو گئے۔ جن مردوں نے مزاحمت کی ان کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا اور خواتین کو جنسی ہراساں کرنے کے لیے گھوڑوں پر رکھ لیا۔ ناول نگار نے زنجیوں کے قتل کا منظر اور نسطوری راہبوں کی مزاحمت کو الم ناک صورتِ حال میں بیان کی ہے۔ ظلم و بربریت کے خلاف مزاحمت کے عظیم استعارے کی پہچان ہمیشہ حسین ابن علی کے نام سے ہوتی رہے گئی۔ جمیلہ نے مزاحمتی حوالے سے حسین ابن علی کے کردار کے مختلف محاسن کو عمدگی سے صفحۂ قرطاس پر رقم کیا ہے:

"زندگی کیا ہے کہ حسین ابنِ علی کو بچایا نہ گیا اور حسین اپنے کس وعدے کو نبھا رہے تھے۔ ان کو یہ قربانی بہرحال دینا تھی تاکہ قربانیوں اور سرفروشیوں کا مذہب رواج پا سکے۔ مذہب عشق کی تبلیغ اس کے سوا آخر کیسے ہوتی؟ اگر کوئی کمتر شخص دشتِ کربلا میں کنارِ فرات اپنے خاندان کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جاتا تو اس کی اتباع کے لیے کون نکلتا"(24)

قرمطیوں کے قافلے پر حملے اور حسین بن منصور کے ان کو بے دست وپا کر دینے کی کہانی بھی سحر انگیز ہے کیونکہ جب بھی کوئی انسان اللہ کی طرف رجوع کرے تو اس کی باطنی طاقتیں بے حساب ہو جاتی ہیں۔ ناول میں جب حسین بن منصور کے قافلے کے افراد صبح صادق کے وقت تہجد پڑھنے میں مشغول تھے تو عقب سے قرمطیوں نے خاموشی سے لوٹ مار شروع کر دی۔ حلاج نے مزاحمتی رنگ اپناتے ہوئے اپنی باطنی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے ان سے مخاطب ہوا کہ اگر تم باز نہ آئے تو اس کا انجام بہتر نہیں ہو گا۔

مصنفہ نے ناول میں قرمطیوں اور اور حاجیوں کے درمیان جاری لڑائی اور مزاحمت کو جامع انداز میں بیان کیا ہے، جب حسین ابن منصور کا قافلے کا فاجروں سے آمنا سامنا ہوا تو سخت لڑائی ہوئی قافلے کی تھوڑی سی غفلت سے قرمطی حاجیوں پر ٹوٹ پڑے جس کے نتیجے میں اونٹوں نے کئی حاجی کچل ڈالے۔ حلاج کے قافلے میں موجود کئی افراد کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا اور عورتوں کو تشدد کے بعد قتل کر دیا گیا۔ جن مردوں نے مزاحمت کی ان کو ایک قطار میں کھڑے کر کے سر قلم کر دیے گئے اور زخمیوں کو پانی مانگنے پر بھی چن چن کر قتل کیا گیا۔ اس جنگ میں حسین بن منصور بھی شدید زخمی ہوا تھا۔ دولت فاطمیہ کا بانی درویش صفت اور بہادر عبید اللہ المہدی بھی حسین بن منصور حلاج کی طرح ناقابل شکست تھا۔ مصنفہ نے خلیفہ کی فوج کے خلاف عبد اللہ المہدی کی طرف سے کی جانے والی بھرپور مزاحمت اور خلیفہ کی فوج کی شکست کا تذکرہ بھی عمدگی سے کیا ہے:

> "حسین بن منصور حلاج کی طرح عبید اللہ المہدی بھی ناقابل تسخیر تھا وہ نہایت درویش صفت حاکم،
> پہاڑوں کا سا حوصلہ رکھنے والا اس کی فوجوں کے لیے ایک آتشیں دیوار ثابت ہوا جس سے ٹکرا کر سب
> فوج خاک ہو گئی۔ خود حامد نہایت مشکل سے جان بچا کر بغداد کی طرف پلٹا تھا۔"(25)

جمیلہ ہاشمی نے حسین بن منصور اور حامد بن عباس کے درمیان نزاع کی اصل وجہ حامد کی بیوی "اغول" کو بتایا ہے، جو کہ حسین سے محبت کرتی تھی اور اس محبت کا اقرار اس نے مرتے وقت کیا تھا۔ حامد کو اس کی اطلاع ہو گئی تھی اور اس نے اس کا بدلہ لیا۔ اس وقت کے تمام قاضیوں اور علما سے اس فتوے پر دستخط لیے جس میں انا الحق کہنے کی پاداش میں حسین کو سولی چڑھانے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس فتوے پر صرف ابو بکر شبلی اور ابن عطا کے دستخط نہیں تھے۔ جنید بغدادی جیسے وقت کے مشہور صوفی کے دستخط بھی تھے۔ یہاں شبلی اور ابن عطا کے کردار مزاحمت کی ترجمانی کرتے ہیں جنھوں نے حامد بن عباس جیسے مغرور اور متکبر وزیر کے احکام کو بھی درخور اعتنا نہ جانا اور اپنا بھرپور احتجاج ریکارڈ کرایا۔ حسین سے بدلہ لینے والے وزیر حامد نے ایک ہزار کوڑوں کی سزا خلیفہ سے دلوائی محض اس لیے کہ وہ حسین کی ایک چیخ سننا چاہتا تھا۔ جمیلہ نے یہاں تاریخ کے جبر کے خلاف سینہ سپر ہونے والے حسین کی یادگار مزاحمت کو کمال فنی ہنر مندی سے عکس بند کیا ہے جو تاریخ کے جبر کو اور حامد کی خواہش کو روندنے میں کامیاب ہوا۔ حامد اتنی بڑی سزا دینے کے باوجود حسین کی چیخ نہ سن سکا۔ کیونکہ حسین ہر بار کوڑا لگنے کے باوجود مسکرا اٹھتا۔ جمیلہ ہاشمی لکھتی ہیں:

"بغداد کی شاہراہوں پر رونق بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ دیوانہ سخت جان تھا۔ کوڑوں کی شدید ضرب بھی اسے آہ کھینچنے پر مجبور نہ کر سکی تھی۔ وہ زندہ تھا اور "اناالحق" کہہ رہا تھا۔ پھر لوگوں نے محسوس کیا کہ کوڑے کی ہر ضرب اناالحق کہہ رہی تھی۔ اور ہوا فضا سب اس کلمہ کفر سے معمور ہونے لگی تھی۔ خود حبشی آہ کرنے کی جگہ اناالحق کہہ رہا تھا۔ عجیب بات تھی۔۔۔ کچھ لوگ یونہی سنگباری کرنے لگے۔۔۔ وہ چٹان تھا اور عوام پانی کے ریلے کی طرح اس سے آکر ٹکراتے اور لوٹ جاتے تھے۔ سنگباری بھی ایک ساز کی طرح اپنی لے بدلنے لگی۔ ہر پتھر جو دیوانے سے چھو جاتا "اناالحق" کہنے لگتا۔"(26)

اس روایت کے مطابق جو کہ اخبار الحلاج ۱۵ میں منقول ہے، حلاج ایک بار بازار سے گزر رہے تھے تو ایک چوبارے سے ان پر ایک سایہ پڑا۔ حلاج نے اسے دیکھا، ایک خوبصورت عورت تھی۔ تب حلاج نے مجھے کہا۔ ایک دن تم دیکھو گے کہ اس ایک "نظر" کے سبب مجھ پر کیا افتاد پڑے گی۔

انیس ناگی نے اپنے ناول "چوہوں کی کہانی" (1995ء) میں ناگہانی آفات کے دوران انسانی خود غرضی اور نفسا نفسی کے عالم کی بھیانک تصویر دکھائی ہے۔ علاوہ ازیں بتایا کہ سرحدوں کی لکیریں ہو سکتی ہیں لیکن انسانیت کا درد رکھنے والوں کے لیے یہ لکیریں اہمیت نہیں رکھتی۔ انیس ناگی کے دیگر ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی ایک ایسا مضطرب کردار تخلیق ہوا ہے، جو گردونواح میں پھیلی خوب صورتی کی تلاش میں نکلا تو ہے لیکن جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے۔ ناول کا یہ کردار میونسپل کمیٹی کے ریٹائرڈ افسر کی صورت میں ابھرتا ہے جو کہ حالات کی سنگینی سے پیدا ہونے والی صورت حال کا اسیر ہے اور جو اپنی ہی آواز کی بازگشت سے خوف زدہ ہے۔ ناول کا مرکزی کردار اور سورت شہر کے ہندو ڈاکٹر "شنکر" اپنی اپنی سرحدوں میں قید ہیں جتنے کہ ایجنسیوں کے گھرے جرائم پیشہ افراد ہوتے ہیں۔

مذکورہ ناول میں ڈاکٹر "شنکر" کا کردار مزاحمتی ہے۔ مزاحمت کا پہلا رنگ اس وقت سامنے آتا ہے، جب سورت شہر میں طاعون کی وبا پھیلنے کے باوجود حکومتی سطح پر لوگوں کو وبا سے بچنے کے لیے احتیاطی تدابیر نہیں بتائی جاتیں، جس کے سبب ان کا علاج بھی نہیں کیا جاتا ہے۔ مریضوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر ڈاکٹر شنکر اپنے طور پر پریس کانفرس کر کے لوگوں کو بتانا چاہتا ہے۔ یوں وہ ایک ایسے نظام کے خلاف مزاحمت کرتا ہے، جو صرف اپنے مفادات کی خاطر جینا چاہتے ہیں اور جہاں غریب کے لیے کچھ نہیں۔ ناول میں ڈاکٹر "شنکر" کا کردار اپنی نوکری کو داؤ پر لگا کر غریبوں کے علاج معالجے کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ ڈاکٹر شنکر کی پریس کانفرنس روکنے کے لیے مقتدر طبقے کے افراد اس کے پاس آتے ہیں اور دھمکی دیتے ہیں کہ ان کے مفادات کی راہ میں مزاحم نہ بنو:

"یہ سوچ کر اس نے کل صبح 11 بجے اپنے بنگلے پر پریس کانفرنس کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بات سورت کے پڑھے لکھے طبقے میں پھیل گئی تھی کہ سورت میڈیکل کالج کا پروفیسر آف میڈیسن طاعون کے بارے میں کچھ اعلانات کرنا چاہتا تھا۔ اس مبہم صورتحال میں جب کہ شہر میں کھلبلی مچی ہوئی تھی، ڈاکٹر شنکر رات گیارہ بجے سوٹ پہنے ڈرائنگ روم میں ٹی وی کے سامنے بیٹھا بی بی سی کے خبر نامے میں

ملک میں طاعون اور سورت شہر کی غلاظتوں کے ڈھیروں کی تصاویر دیکھ کر مسکرایا۔ "باسٹرڈ" کو اب گوروں کی بات پر یقین آجائے کہ انہوں نے یہاں کی سب پروازیں روک دی ہیں۔"(27)

ہیلتھ منسٹر اور حکمران طبقے کے دیگر افراد ناول کے مرکزی کردار کو طاعون کا ٹیکہ لگانے کا حکم دیتے ہیں۔ انیس ناگی نے یہاں بھارتی حکمرانوں کی چیرہ دستیوں اور مظالم کی ہلکی سی فہرست گوش گزار کی ہے، جس کو پڑھ کر ہندوؤں کا مکروہ چہرہ سامنے آجاتا ہے جبکہ ڈاکٹر شنکر ہندو ہونے کے باوجود انسان دوست ہے اور پاکستانی مسلمانوں کو زبردستی طاعون کا مریض بنانے کے فیصلے کی تردید کرتا ہے۔ یہاں مزاحمت معاشرتی بھی ہے اور تاریخی بھی ہے۔

ڈاکٹری ایک مقدس پیشہ ہے چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو وہ لوگوں کے لیے مسیحا ہوتا ہے ناول میں انسان دوست ہندو ڈاکٹر نے دباؤ کے باوجود اپنے مسیحا ہونے کا حق ادا کیا اور مرکزی کردار کو طاعون کے جراثیم والا انجکشن نہیں لگایا۔ مزید کہا کہ میں ڈاکٹر ہوں قاتل نہیں۔ ڈاکٹر شنکر کے ظلم کے خلاف مظلوم کے حق میں کھڑے ہو جانے کے منظر کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"اس کا چہرہ میرے چہرے کے قریب تھا، اس نے آہستہ سے کہا۔ "نوجوان میں ڈاکٹر ہوں، قاتل نہیں ہوں، میں تاریخ کے خلاف فیصلہ نہیں کر سکتا، میں انسان ہوں اور انسانیت میرا مذہب ہے"۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر شنکر نے آہستہ سے سوئی باہر نکال لی۔ "دیکھو، یہ خواب آور ٹیکہ ہے اور اس کے چند لمحوں بعد تم پر غنودگی چھا جائے گی، گڈ بائی"(28)

وحید احمد کا ناول "زینو" (2003ء) بھی عصرِ حاضر میں لکھا جانے والا تاریخی ناول ہے، جو ناول، داستانوی، سائنس فکشن اور رومانیت کے عناصر کے امتزاج سے تخلیق کیا ہے۔ وحید احمد نے ناول میں اپنی معلومات کو عمدگی سے قاری کے سامنے بیان کیا ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور ناول میں اس کا اظہار جا بجا ملتا ہے۔ ناول نگار نے ناول میں سکندرِ اعظم کے دور سے لے کر موجود صدی کی معاشرتی صورت حال کو بیان کیا ہے۔ قدیم یونان کے فلسفی ارسطو کے عہد کے انسان کا نقطہ نظر بھی رقم کیا ہے۔ وہ "دارا" سے بھی مکالمہ کرتا ہے اور پھر برف میں دفن ہونے کے بعد موجودہ صدی میں ریویو کی صورت میں آتا ہے جو کہ جدید ٹیکنالوجی کی وساطت آیا ہے۔ اکیسویں صدی کا انسان گلوبلائزیشن کے باعث جنگ و امن کے مسائل اور دینوی طاقتوں کا آپس میں ٹکراؤ ہوتا دکھایا ہے۔

ناول مرکزی کردار "زینو" کی کتھا ہے، جو نیو گلوبل مائنڈ کا حامل انسان ہے۔ ناول میں مزاحمت کا پہلا رنگ اس وقت سامنے آتا ہے جب مغل حکمران شاہ جہاں کا بڑے بیٹے دارا کی فوج کے سپاہوں کے آسیب زدہ جزیرے کی طرف گشت کے بعد زینو

کے باپ کو قتل کرتے ہیں۔ بعد ازاں چار سپاہوں کے قتل کے بعد آخری سپاہی کی زینو کی ماں کی عصمت دری کرتے ہیں تو زینو کی ماں بھرپور مزاحمت کرتی ہے۔ماں کا سپاہی کو خنجر کے وار سے قتل کرنے اور خود مارے جانے کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی ہے:

> "سپاہی کی وحشت اس اصیل مرغ کی طرح تھی جو چھری کے وار سے باہر نکل جائے اور اُس کی آدھی شہ رگ کٹی ہوئی ہو۔ بالآخر جب اُس کی آنکھیں دُھندلائیں تو عورت نے اپنا ہوش مجتمع کرتے ہوئے خنجر اُس کی کمر سے نکالا اور سپاہی کے پیٹ میں پیوست کر دیا عورت کی ٹانگیں ابھی تک سپاہی کے شکنجے میں تھیں بے اختیار سپاہی نے پلک جھپکنے میں خنجر اپنے پیٹ سے نکالا، آخری نظروں سے ایک بار پھر عورت کے جمال کو دیکھا اور اُس پر گر گیا مگر خون آلود خنجر کا رُخ عورت کے پیٹ کی طرف تھا اور خنجر کے دستے پر ہاتھوں کی گرفت بہت مضبوط تھی۔"(29)

ناول نگار نے اس صورت حال کی عکاسی دلدوزی سے کی ہے جہاں اکیلی عورت کو پا کر کمزور مرد بھی اپنی شہوت کو بجھانے کی کوشش کرنے کی سوچنے لگتا ہے۔ چنانچہ سپاہی کا اپنی مردانگی دکھانے اور اسلحے کے بل پر نہتی عورت کی عصمت دری کرنے اور عورت کا عصمت لٹانے کے باوجود موقع ملنے پر سپاہی کو موت کے گھاٹ اتارنے اور خود مارے جانے کا بیان الم ناک بھی ہے اور عورت کی مزاحمتی فکر کا غماز بھی۔

ناول میں چونکہ یونان اور ہندوستان کے مختلف حکمرانوں کا عہد کے سیاسی اور معاشرتی صورت حال کو بیان کیا ہے۔ اس لیے مختلف حکمرانوں کے درمیان ہونے والی لڑائیوں کی عکس بندی بھی کی ہے اسی طرح سکندر و دارا کے درمیان لڑی جانے والی جنگ کا تذکرہ جو دارا کی سرزمین پر لڑی گئی اور دارا کی فوج کی طرف سے شدید مزاحمت کے باوجود اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا:

> "ایک پہر گزر گیا۔ دارا اور سکندر نے ایک دوسرے کو پہلی بار آمنے سامنے دیکھا۔ دونوں فوجوں کی فصلیں کھڑی تھیں، جن میں نیزے سرکنڈوں کی طرح اُگے ہوئے تھے۔ پھر وہی ہوا جو جنگوں میں ہوتا ہے۔ ہوا میں دو فوجیں بر سرِ پیکار تھیں مگر زمین پر گرنے والے خون سے حسب و نسب اور رنگ و نسل کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ دارا ہارا۔"(30)

دارا، ایران کی عظیم سلطنت کا فرمانروا، سکندر کے مقابلے پر آیا تو دفاع اس کا مطمع نظر تھا کیونکہ سکندر غاصب کی حیثیت سے اس کے ملک میں داخل ہوا تھا۔ مصنف نے دارا کی بھرپور مزاحمت اور اس کے باوجود اس کی شکست کی کہانی عمدگی سے بیان کی ہے۔

فہمیدہ ریاض کا تاریخی ناول "قلعہ فرموشی (2017ء) میں تاریخ کے پہلے اشتراکی مزدک کی کہانی ہے، جو چوتھی اور پانچوں صدی میں ایرانی اور رومن سلطنتوں کے ٹکراؤ سے تخلیق کی ہے۔ فہمیدہ ریاض اگرچہ شاعرہ کے طور پر معروف ہیں لیکن انہوں نے اپنی مزاحمتی فکر کی عکاسی اس ناول میں بھرپور کی ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور وہ بغیر لگی لپٹی رکھے اپنی بات کہنے کا ہنر جانتی ہیں۔ اس ناول میں ان کے مشاہدے کی دلیل ملتی ہے۔ اپنی وسیع معلومات کو انھوں نے ناول کے صفحات پر عمدگی سے بکھیرا

ہے۔ مصنفہ نے کارل مارکس کے تعلیمی اثرات کو موجودہ عہد میں بھی سامنے لانے کی سعی کی ہے۔ ناول میں ایسے زمانے کی داستان بیان کی ہے، جب تاریخ، ما قبل تاریخ کے بطن سے جنم لیا تھا اور جب مذاہب اپنی ارتقائی منازل طے کر رہے تھے۔ ان شہروں کی داستان ہے، جو اس وقت وجود نہیں رکھتے تھے۔ ناول تاریخ سے موجودہ عہد تک انسانی مساوات کی جدوجہد کے تسلسل کی داستان سناتا ہے، جہاں کبھی ایرانی سلطنت کا پرچم لہراتا تھا اور سترہ برس قبل بھی مزدکی تحریک سے متاثر ہوئے تھے۔

ساسانی سلطنت کے حکمران "روٗسا" کا یہ وطیرہ تھا کہ وہ کسانوں اور کمیوں کی عورتوں کی عصمت دری کرتا اور کسان ڈر کے مارے کسی بھی قسم کی مزاحمت نہیں کرتے تھے۔ لیکن ہر عمل کا ردعمل بھی ہوتا ہے۔ فہمیدہ ریاض نے اس کی تشریح اس اقتباس میں عمدگی سے کی ہے جہاں روٗسا اپنی خواتین کو توجہ دینے کے بجائے عام لوگوں کی بیویوں سے جسمانی حظ اٹھاتا تھا تو ردعمل میں ان کی بیویاں کسانوں سے جنسی اختلاط کرتی تھیں:

> "ازروئے نسب!'وہ سوچ رہا تھا۔' جس طرح عامیوں کی عورتوں کو دن رات یہ روٗسا اٹھالے جاتے ہیں تو کتنے ہی نسبی شہزادگان اورورزگان تو کسانوں کی جھونپڑیوں میں کھیل رہے ہیں۔اور ان کی عورتیں۔ ۔ جو کسانوں کے کسے کسائے جسموں پر فریفتہ رہتی ہیں۔ کیا کوئی سچ مچ بتا سکتا ہے کہ کتنے کسانوں کے بیجوں کا پھل ان محلات کے باغوں میں جوانی کا رس پکڑ رہا ہے!'اس نے اپنے زردوزی کے جوتوں کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ وہ سوچ رہا تھا:' یہ ایک ایسا راز ہے جو اس دربار میں بیٹھا یا کھڑا ہوا ہر شخص جانتا ہے اور کوئی لب پر لانے کی ہمت نہیں کرتا۔"(31)

فطرت اپنا راستہ نکال لیتی ہے چنانچہ اس بات کی واضح ترجمانی اس اقتباس سے ہو جاتی ہے جو اوپر درج کیا گیا۔ جہاں روٗسا بے بس خواتین سے جسمانی تعلق استوار کر لیتے تو ان کی اپنی خواتین بھی بے کس لیکن محنت پسند کسانوں کے ورزشی جسموں سے حظ اٹھانا پسند کرتیں تھیں۔

ناول میں ساسانی عہد کی منظر کشی مکمل باریک بینی سے کی گئی ہے۔ ناول میں پہلے سوشلسٹ مزدک کے مکالموں کے ذریعے جاگیرداری نظام کے خلاف مزاحمتی رنگ دکھایا ہے کہ مزدور محنت کر کر تخت پر بیٹھے بادشاہوں کے لیے اناج جمع کرتے رہتے تھے، جن کے گھر کا ایک ایک فرد ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سال بھر پیٹ بھر کر کے کھا سکتے تھے لیکن غریب، حواری کا بچہ بھوک کے سبب مر جاتا ہے۔ فہمیدہ نے اس نظام کی سیاہی کو مکمل کراہت کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے جس میں حق دار کو اس کا حق نہیں ملتا اور امیر لوگ محض اپنی دولت اور اثر کے بل بوتے پر غریبوں کا جسمانی، جنسی اور معاشی استحصال کرنا اپنا فرض جانتے ہیں لیکن جب حالات کے تھپیڑوں کا شکار غریبوں کو کوئی مسیحا نظر آتا ہے تو وہ بدلہ لیے بنا نہیں رہتے۔ ناول نگار کی مزاحمتی سوچ کی عکاسی ناول میں جابجا نظر آتی ہے۔ مزدک، مزاحمت کا استعارہ بن کر ابھرتا ہے، جو غریبوں کو ایک نئی سوچ دیتا ہے اور ان کو اپنے حق کے لیے

کھڑے ہونے اور ظالم کے مقابل آنے کا درس دیتا ہے۔ مصنفہ نے اس عہد کی سلطنت کے جاگیر داری نظام کے خلاف احتجاجی رویہ اختیار کرتے ہوئے ایسے نظام کے منہ پر ایسا تھپڑ رسید کیا ہے جس کی گونج عہد حاضر میں بھی آتی ہے۔

فہمیدہ ریاض کا وژن وسیع ہے۔ ان کے ہاں نام نہاد مذہبی پابندیوں کے خلاف مزاحمت کا پہلو نظر آتا ہے۔ بھوک سے مرتے کسانوں کو زندگی بخشنے کے لیے ان کو جینے کا موقع دینے کے لیے جس طرح مزدک نے عبادت گاہ کا چمٹا کسانوں کو عنایت کیا اور کہا کہ پگھلا کر برابر برابر بانٹنا جبکہ کسان آتش کدہ کے چمٹے کو نہیں لے جانا چاہتے تھے لیکن پیٹ کی آگ نے انھیں مجبور کیا جن سے ان کے پیاروں کی زندگی کا لمحہ لمحہ ختم ہو رہی تھی۔ یہاں ناول نگار نے اس معاشی استحصال پر بہت بڑا طنز کیا ہے، جو مذہبی پیشوا اور حکمرانوں نے عوام پر مسلط کیا تھا۔

جب ظلم حد سے بڑھ جائے تو پھر ختم ہو جاتا ہے۔ مصنفہ نے اس فلسفے کی عکس بندی بھی کی ہے زرمہر غریب عوام اور بھوکے ننگے کسانوں کے لیے موت کا استعارہ تھا۔ بادشاہ کا تختہ الٹنے اور اس کی جگہ زرمہر کو مقرر کرنے کی ناکام کوشش بعد ازاں زرمہر کے قتل کی تفصیل کو مفصل بیان کی ہے:

> "ٹھیک تین دن بعد اس قحط زدہ شہر میں سنسنی پھیل گئی۔ زرمہر کو اس کی جاگیر پر قتل کر دیا گیا تھا۔ سات فوجی سوار اس کے گھر پر آئے تھے۔ پھر کچھ جھگڑا ہوا۔ پہرے داروں نے سواروں کو تیزی سے واپس جاتے دیکھا تھا۔ اندر زرمہر کی لاش سر بریدہ خون میں نہائی پڑی تھی۔"(32)

فہمیدہ ریاض نے مزاحمت کے جس پہلو کو متعارف کروایا ہے وہ حیران کن ہے۔ یہ سیاسی اور معاشی مزاحمت ہے۔ دولت پر سانپ بن کر پہرہ دینے والے اور غریبوں مسکینوں اور مظلوم رعایا کا معاشی اور جسمانی استحصال کرنے والے امرا کے بھیانک چہروں سے پردہ تو مصنفہ نے اٹھایا ہے ساتھ ہی بادشاہ کو رعایا کے قریب کرنے اور محبت عام کرنے کا نسخہ بھی مزدک کی زبانی سنایا ہے کیونکہ مزدک کے نزدیک حقیقی طاقت اس وقت ہی آتی ہے جب بادشاہ رعایا کو خوش کرتا ہے۔

ناول کا بنیادی کردار "مزدک" انسانی فلاح و بہبود کے پیامبر کا کردار ہے جس کے نزدیک تمام انسان مساوی ہیں کسی کو کسی پر کوئی فوقیت نہیں ہر وہ فرق جو انسانوں کے درمیان افتراق پیدا کرے اسے مٹا دینا چاہیے۔ اسی لیے ناول میں ساسانی عہد میں مظلوموں کے قتل عام کا حامی نہیں بنتا اور انسانوں کا قتلِ عام بدترین گناہ سمجھتا ہے۔ مصنفہ نے عقل و فہم سے معاملہ حل کرنے والے مزدک کے روشن پہلو کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "چلتے چلتے سیاوش نے کہا: "عالی جاہ، ان تمام پہریداروں اور منتظمین کو، جنھوں نے آج ہمیں یہاں آتے ہوئے دیکھا ہے، مع اس کنیز کے، صبح ہونے سے پیشتر خاموش کر دیا جائے۔'مزدک چونک گیا۔'ہرگز نہیں!" اس نے کہا۔ "میں بے قصوروں کے قتل و خون کی حکمتِ عملی میں شامل ہونے سے انکار کرتا ہے۔"۔ سیاوش نے بیزاری سے کہا۔ "آپ ان معاملات میں دخل نہ دیجئے۔ آپ کو ذرہ

برابر علم نہیں کہ معاملاتِ سلطنت کیسے چلتے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ۔۔۔میں انکار کرتا ہوں!مزدک نے مضبوطی سے کہا۔'انسان کا خون بہانا بدترین گناہ ہے"(33)

مظلوم انسانوں کے اذہان سے غلامی کا بھوت اتارنا آسان نہیں ہوتا۔ ایسا تب ہی ممکن ہے ہو سکتا ہے جب ان کا ساتھ دینے والا طاقتور ہو جس پر ان کا اعتماد ہو مزدک کی تقریر کے بعد شہنشاہ قباد کی تقریر نے مزدوروں اور کسانوں کے حوصلوں کو پروان چڑھایا اور استعماریت کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بنتے ہوئے حکم دیا کہ جاؤ امیروں کے گوداموں سے اپنے بھوکے بچوں کے لیے خوراک لے لو۔ اس کے علاوہ فہمیدہ ریاض نے انسانی رویوں اور کیفیات اور نفسیات کی عمدگی سے تصویر کشی کی ہے:

"اے پیغمبر خدا، میں خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔" پھر اس نے مجمعے سے مخاطب ہو کر کہا:'میں آپ کا بھائی ہوں، جب کہ آپ بھوکے ہیں تو آب ودانہ میرے لیے زہر کی مانند ہے۔ میں، مملکتِ ایرانیان کا شہنشاہ جو اس سرزمین کے ذرے ذرے پر مکمل اختیاراور قوت رکھتا ہے، آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ آپ امرا کے گوداموں سے، ابھی اوراسی وقت اپنے اوراپنے معصوم بچوں کے لیے خوراک لے لیں۔"(34)

کسی بھی معاشرے میں جب کوئی بھی طاقتور غریب پر ظلم کے پہاڑ گرائے گا تو ردعمل میں غریب بھی مزاحمت کرے گا۔ ناول میں بھی ساسانی عہد کے امرا کے خاندان نے کسانوں اور کاریگروں کو قتل کیا تو مزاحمت کے دوران غریب لوگوں کی طرف سے امرا کے گھروں کو لوٹنے اور املاک کو تباہ کر دینے کے ساتھ ساتھ جنسی استحصال کی کیفیت اور منظر کشی کرب ناک انداز میں کی ہے:

"اور یہ جاگیردار، اوران کا خاندان۔ ہم ان کی جان نہ لیتے۔ دودن پہلے جو امراء کا خاندان جاگیری مسلح دستے کے ساتھ کسانوں اور کاریگروں کو قتل کرتا ہوانکلا تھا، اصطخر کے راستے پر، انہوں نے تین کان کنوں اورایک لوہار کو قتل کرڈالا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر جاکر ان کے ہی مسلح دستے نے ان امراء کا بچہ بچہ مارڈالا تھااوراسباب سے بھرے چھکڑے، ساراسوناچاندی ہتھیا کر بھاگ گئے تھے۔ امراء کے خاندان کی لاشیں اب بھی اصطخر کے بڑے راستے پر پڑی ہیں۔ ان کو گیدڑ اور لکڑ بھگے کھارہے ہیں۔ عورتوں کو بھی مارڈالا!برزین نے صدمے سے کہا۔ دین میں عورت پر ہتھیاراٹھانا گناہِ کبیرہ تھا۔"(35)

مرزاحامد بیگ کاناول انارکلی"(2018ء) تاریخی شعور کی چاشنی سے لبریز ایک ایسا فن پارہ ہے، جس میں ناول نگار قاری کو بیک وقت ماضی اور حال میں محو سفر رکھتا ہے۔ ناول کی حیثیت دستاویزی ہے، جس میں فلم یونٹ کے ارکان کی طرف سے "انارکلی" فلم بنانے کے خیال کو مختلف لیکچرز کی مدد سے بیان کیا ہے۔ ناول میں دو طرح کی کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں ایک کہانی کے مرکزی کردار "شہریار مرزا" اور "شازیہ حیات" ہیں، جو ایک دوسرے سے محبت کرنے کے باوجود وقت کے بے رحم ہاتھوں کا شکار ہو کر وصل سے شاد نہیں ہو پاتے ہیں اور وقت کی دھول میں ان مٹ اذیت کی سیاہی میں ڈوب کر الگ الگ زیست گزرانے پر مجبور ہو

جاتے ہیں۔ دوسری کہانی تاریخی ہے جس کا تعلق اکبر اعظم اور شہزادہ سلیم کے دور سے ہے اور محبت کی کہانی کے ستون کا ایک تیسرا سرا "انارکلی" ہے جو دو ہاتھیوں کی جنگ میں چیونٹی کی طرح مسلی اور کچلی گئی۔

مرزا حامد بیگ نے "انارکلی کے حوالے سے جہاں بہت سی تاریخی موشگافیوں کو درست کرنے کی سعی کی ہے وہیں انہوں نے بعض ادبی بد دیانتیوں کی نشان دہی کی ہے خصوصاً ڈرامہ "انارکلی" کے اصل حقائق کے متعلق مفصل معلومات بنیادی ماخذ کی روشنی میں دی ہیں۔ ناول نگار نے ان تمام عوامل کا تجزیہ کیا ہے، جس کی وجہ سے اکبر کے عہد اور بعد کے مورخین نے انارکلی کی موت اور اس موت کے سبب کی چھپانے کی سر توڑ کوشش کی تاکہ شاہی خاندان کے ماتھے سے زنا بالمحرمات کا داغ دھویا جا سکے۔

اگر ناول کو مزاحمتی نگاہ سے دیکھا جائے تو مزاحمت کا پہلا رنگ اس وقت سامنے آتا ہے جب 1562ء میں اکبر کے دودھ کے شریک بھائی ادھم خان نے اکبر کے وزیر شمس الدین کو قتل کر دیا تو ردعمل میں اکبر نے پہلے ادہم خان کو مکا رسید کیا اور بعد بے ہوشی کے عالم میں چھت سے نیچے پٹخ دیا۔ ناول نگار نے اکبر کی اس مزاحمتی کارروائی کو مکمل سیاق و سباق کے ساتھ آسان لفظوں میں بیان کی گئی ہے۔

ناول میں مزاحمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ "ابوالفضل" کا قتل "انارکلی" کے زندہ در گور کیے جانے کا سخت ردعمل ہے، جو شہزادہ سلیم کی طرف سے انارکلی کی موت کے بعد سامنے آیا:

> "ابوالفضل کے قتل کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے جہانگیر کا بیان ایسا ہے جیسے ابوالفضل کو قتل کروا کر بھی جہانگیر کا غصہ ٹھنڈا نہ ہُوا ہو۔ یوں انارکلی کا حوالہ نہ ہونے کے باوجود ابوالفضل کے قتل کے باب میں انارکلی کا المیہ بولتا محسوس ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ شہزادہ سلیم کی بغاوت کی وجہ بھی کوئی نہیں بتاتا۔"(36)

1594ء میں شہزادہ سلیم کے حرم شاہی میں پکڑے جانے کے سبب اور شہزادہ سلیم کی صاحب جمال سے شادی کے نتیجے میں جس ذلت کا سامنا اکبر کو کرنا پڑا۔ اس کے بعد اکبر نے اپنے پوتے شہزادہ خسرو کو جانشین مقرر کرنے کے متعلق سوچا جس کا علم شہزادہ سلیم کو بھی ہو گیا۔ باپ اور بیٹے کے درمیان جاری کشمکش اور مزاحمتی فضا کو ناول نگار نے بیان کیا ہے۔ انارکلی کے المیے کی خبر پر شہزادہ سلیم کے دماغ کے الٹ جانے اور باپ کے خلاف مزاحمت کرنے کی روداد سادہ اور عام فہم ان الفاظ میں بیان کی ہے:

> "اُسے ایک خیال یہ بھی آیا کہ لاہور جائے اور بغاوت کا اعلان وہاں سے ہو لیکن ابھی آگرہ کے باہر ڈیرے ڈالے ہی تھے کہ قلیچ بیگ جیسا اکبر کا نامور سپہ سالار اُس سے آن ملا، جو آگرہ کا قلعہ دار تھا جس سے پتا چلا کہ دادی جان مریم مکانی قلعہ آگرہ میں موجود ہیں۔ مریم مکانی نے بپھرے ہوئے شہزادے سے جمنا کے کنارے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو شہزادہ اِلہ آباد کی طرف نکل گیا اور وہاں کی ساری جاگیریں ضبط کر لیں، نیز صوبہ بہار اور اَودھ پر قابض ہو گیا۔"(37)

اقتدار کا لالچ یا انارکلی سے جسمانی تعلق کے ختم ہونے کے سبب شہزادہ سلیم نے اپنے باپ اکبر پر 3 اکتوبر 1605ء کو قاتلانہ حملہ کیا۔ جس کے نتیجے میں چوبیس دن زندگی اور موت کی کشمکش میں گزار کر دنیا سے کوچ کر گیا۔ ناول نگار نے بیٹے کے ہاتھوں باپ کے قتل کی کتھا کو خوں چکاں انداز میں بیان کیا ہے:

> "3 اکتوبر 1605ء کو شہزادہ سلیم کا وار خطا نہیں گیا۔ روایت ہے کہ اکبر زہر خورانی کا شکار ہوا۔ چوبیس دن شدید اسہال سے نبرد آزما رہا اور بالآخر 24 جمادی الآخر 1014ھ بہ مطابق 27 اکتوبر 1605ء کو بہ روز بدھ بہ عمر چونسٹھ برس دُنیا سے کُوچ کر گیا۔"(38)

انارکلی جو اکبر کے قلعہ کی چہار دیواری میں کھیل کود کر جوان ہوئی تو شہنشاہ اکبر نے داخل حرم کیا تو شہزادہ سلیم اس پر دل ہار بیٹھا۔ دونوں کی محبت کے درمیان باپ دیوار بن گیا تو شہزادہ سلیم نے انارکلی کے ذریعے باپ کو زہر دینے کی ترغیب دی۔ بعد ازاں جب قلعہ کے زندان میں طرح طرح کے اذیتیں دے کر جُرم اقرار کرنے کے لیے دباؤ ڈالا گیا تو اس نے ہونٹ سی لیے کیونکہ اس کو ترغیب دینے والا اس کا اپنا محبوب تھا۔

محولا بالا ناولوں کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان ناولوں میں متعدد کہانیوں کا خمیر کسی نہ کسی تاریخی واقعے سے گوندھا گیا ہے۔ تاریخی واقعات کے تناظر میں جنم لینے والی مزاحمت کے کئی رنگ دکھائے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ احتجاج یا مزاحمت کی اصطلاح عہدِ قدیم سے ہی رائج ہے۔ عہد حاضر کے ناول نگاروں نے ان واقعات کے ذریعے موجودہ مادیت پرست سماج کے قاری کو جگانے کی سعی کی ہے کہ وہ اپنے حق کے حصول کے لیے آواز کے ساتھ ساتھ قلم کی طاقت کا بھی استعمال کرے۔

حوالہ جات

1. علی احمد فاطمی، ڈاکٹر، عبدالحلیم شرر بہ حیثیت ناول نگار (کراچی: انجمن ترقی اُردو، 2008ء)، 174۔
2. نیلم فرزانہ، اُردو ادب کی خواتین ناول نگار (لاہور: فکشن ہاؤس پبلی کیشنز، 2017ء)، 130۔
3. خورشید انور، قُرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور (نئی دہلی: انجمن ترقی اُردو، 1993ء)، 86۔
4. قُرۃ العین حیدر، آگ کا دریا (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2015ء)، 69۔
5. ایضاً، 122۔
6. وقار عظیم، سید، ایک ناول نگار، مشمولہ قرۃ العین حیدر اُردو فکشن کے تناظر میں، مرتبین، حسن ظہیر، ڈاکٹر ممتاز احمد خان، شہاب قدوائی (کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، 2009ء)، 293۔
7. قُرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، 72۔

8. احسن فاروقی، ڈاکٹر، سنگم (کراچی: لبنی پبلی کیشنز، 1971ء)، 32،33۔

9. ایضاً، 38۔

10. ایضاً، 43۔

11. ایضاً، 49۔

12. عبداللہ حسین، اداس نسلیں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2003ء)،4۔

13. ایضاً، 42۔

14. ایضاً، 188۔

15. ایضاً، 260۔

16. ایضاً، 383۔

17. نثار عزیز بٹ، نئے چراغ نئے گُلے، مشمولہ مجموعہ نثار عزیز بٹ (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،2009ء)،337،336۔

18. نیلم فرزانہ، اُردو ادب کی خواتین ناول نگار،144۔

19. قرۃ العین حیدر، آخر شب کے ہمسفر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،2012ء)،66 ۔

20. ایضاً، 120۔

21. سید جاوید اختر، ڈاکٹر، اُردو کی ناول نگار خواتین (نئی دہلی: بسمہ کتاب گھر،2002ء)،153۔

22. جمیلہ ہاشمی، دشت سوس (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،2014ء)،71 ۔

23. ایضاً،80۔

24. ایضاً،96۔

25. ایضاً، 422۔

26. ایضاً،494۔

27. انیس ناگی، چوہوں کی کہانی (لاہور: جمالیات،1995ء)، 99۔

28. ایضاً، 119۔

29. وحید احمد، زینو (فیصل آباد: مثال پبلی کیشنز،2007ء)، 25۔

30. ایضاً، 73۔

31. فہمیدہ ریاض، قلعہ فراموشی (کراچی: آج پبلی کیشنز،2017ء)، 03۔

32. ایضاً،21۔

33. ایضاً،43۔

34. ایضاً، 52،53۔

35. ایضاً، 62۔

36. مرزا حامد بیگ، انار کلی (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، 2018ء)، 94۔

37. ایضاً، 118۔

38. ایضاً، 121، 120۔

References in Roman Script

1. Ali Ahmad Fatmi,Dr,Abdul Hakeem Sharar bahesheat Novelnigar (Karachi: Anjamand Taraqi Urdu, 2008),174.
2. Neleem Farzna,Urdu Adab ki Khawateen Novelnigar (Lahore: Fiction house Publisher,2017),130.
3. Khursid Anwar, Qurantalain Haider k Novelow mai Tareqi shaur (New Dehli: Anjamand Taraqi Urdu, 1993), 86.
4. Qurantalain Haider, Aag ka Darya (Lahore: Sang-e-Meel Publishers, 2015),69.
5. Ibid, 122.
6. Waqar Azeem, Syed, Ak Novelniger , Mashmohla ,Urdu Fiction K Tanazur mai, Murtabeen, Hasan Zaheer, Dr. Mumtaz Ahmad Khan, Shahab Qudai (Karachi: Anjamand Taraqi Urdu, 2009), 293.
7. Ibid, 72.
8. Ahsan Farooqi, Dr. Sangam (Karachi: Lubna Publishers, 1971), 32,33.
9. Ibid, 38.
10. Ibid, 43.
11. Ibid, 49.
12. Abdullah Husain, Udas Naslain (Lahore: Sang e Meel Publishers, 2003), 4.
13. Ibid, 42.
14. Ibid, 188.
15. Ibid, 260.
16. Ibid, 383.
17. Nisar Aziz Butt, Nahy Charag Nahy Gully, Majmooha, Nisar Aziz Butt (Lahore: Sang e Meel Publishers, 2009), 336,337.
18. Neleem Farzna, Urdu Adab ki Khawateen Novelnigar, 142.
19. Qurantalain Haider, Akhar-e-Shab k Humsafar (Lahore, Sang-e-Meel Publishers, 2012), 66.
20. Ibid, 120.
21. Syed Javid Akhtar, Dr, Urdu ki Novelnigar Khawateen (New Dehli: Bisma Publishers, 2002), 153.

22. Jameela Hashmi, Dasht-e-Soos (Lahore: Sang e Meel Publishers, 2014), 71.
23. Ibid, 80.
24. Ibid, 96.
25. Ibid, 422.
26. Ibid, 494.
27. Anees Nagi, chuhon ki Kahani (Lahore: Jamaliyeat, 1995), 99.
28. Ibid, 119.
29. Waheed Ahmad, Zenoo (Faislabad: Misal Publishers, 2007), 25.
30. Ibid, 73.
31. Fahmeeda Raiz, Qila Faramoshi (Karachi: Aaj Publishers, 2017), 03.
32. Ibid, 21.
33. Ibid, 43.
34. Ibid, 52,53.
35. Ibid, 62.
36. Mirza Hamid Baig, Anar Kali (Islamabad: Dost Publishers, 2018), 94.
37. Ibid, 118.
38. Ibid, 120,121.